احمد ندیم قاسمی کا افسانہ معاشی جبریت کا عکاس (تحقیق و تجزیہ)

عمارہ طارق

Abstract :

Ahmad Nadeem Qasmi's is recognized as a brighten era of literature. Qasmi Sb has proven his distinction in every field of fiction, poetry, story writer, dramatist, novelist/short story, columnist/journalist due to his unique ideas and topics. But, his short story writing work due to his revolutionary & consultative/diligence thoughts has given a stature in contemporary urdu literature which rarely own by any other author.

He has made masterful depiction of rural culture and its issues, middle class and curse of labors in cities in his short stories. His writings enlighten the emotions of sincerity, truthfulness, justice, equality, patience, forgiveness, humanism and patriotism. Qasmi sahib has opposed Class system, Unequal distribution of wealth, Coerce, Exploitation, Depredation/pillage, Shortsightedness, Prejudice in his different short stories in very sublime way which was caused due to unequal /unjustified economic system, capitalism and feudalism systems.

This research article covers short stories which illuminate the negative features of such systems, which is certainly a proof of caliber & intellectual skill of Ahmad Nadeem Qasmi.

احمد ندیم قاسمی ادبی اُفق پر چمکنے والا وہ تابندہ ستارہ ہے جو اپنی روشنی سے اندھیروں کو منور کر دیتا ہے۔ اُن کی صدا سماعتوں کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے تو ان کی تحریر بصارتوں کے لیے جستجو کے در وا کرتی ہے۔ ان کے حقائق پر مبنی معنی خیز الفاظ جہاں ضمیروں کو کچوکے لگاتے ہیں وہیں یہ تلخ حقائق مثبت تبدیلیوں کا پیش خیمہ بھی بنتے ہیں۔ ان کی تحریریں شر کے پردوں کو چاک کر کے نفرت وکدورت کی فضاؤں میں سچائی، محبت اور خیر کی خوشبو گھولنے کی ضامن ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صداقت اور خیر کے علمبر دار ہیں۔

گذشتہ ساٹھ، ستر برس میں پاکستان کے دیہات اور شہر جس سماجی، تہذیبی اور معاشی انتشار و بحران کی شکار رہیں اور اس بحران نے جس شدت کے ساتھ ہمارے رشتوں کو جذباتی اور نفسیاتی طور پر متاثر کیا ہے اس شدت کو ندیم نہ صرف دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں بلکہ تحریر کا حصہ بھی بناتے ہیں۔

پروفیسر محمد فتح ملک لکھتے ہیں:

> ''ہمارے جذباتی اور روحانی رشتوں میں شکست و ریخت کا جو بھیانک عمل جاری ہے اس کی ترجمانی اور تنقید کا فریضہ احمد ندیم قاسمی نے اس انداز میں کیا ہے کہ جہاں زمانہ حال کا اقتصادی اور سیاسی استحصال بے نقاب ہو گیا ہے وہاں ماضی کی زندہ روایات کے سہارے تعمیر نو کے امکان بھی روشن ہو گئے ہیں۔"[۱]

احمد ندیم قاسمی اس حقیقت سے بجا طور پر باخبر تھے کہ ملکوں کی بقا اور ترقی کی بنیاد میں اس ملک کا اقتصادی نظام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نظام اگر مثبت پہلوؤں پر نشونما پائے تو ترقی کا زینہ بنتا ہے اور قوموں کو اوجِ کمال بخشتا ہے مگر جب یہ نظام استحصالی افکار اپنا لے تو قومیں روبہ انحطاط اور تنزل کی جانب بڑھنے لگتی ہیں۔ ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہی نہیں بلکہ مفسر بھی ہوتا ہے اور اس شاہراہ پر زندگی کے تمام راستے یکجا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی نے ایک ادیب کی حیثیت سے اس شاہراہ پر حقیقت و صداقت کے ایسے بیج بوئے جو وقت کے ساتھ ساتھ گھنے پیڑوں کی شکل میں مسافروں کے لیے ٹھنڈی چھاؤں ثابت ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں استحصالی معاشی نظاموں، اقتصادی زبوں حالی اور غیر متوازن طبقاتی نظام اور استحصالی رویوں کو واضح طور پر بیان کیا۔

ہمارے ملک میں مضبوط بنیادوں پر نشو ونما پانے والے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اپنے منفی پہلوؤں سے جس انداز میں معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں ندیم کا افسانہ ان کے خلاف ایک واضح للکار رہے۔ یہ افسانے ایک رخ سے ان استحصالی نظاموں کے خلاف قاسمی کی عملی کوششوں کے بھی عکاس ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے وعدوں سے روگردانی کر کے زمینداری اور جاگیرداری نظام کو تحفظات دینے کی روش اپنا لی گئی تو ان حالات نے کسانوں اور مزارعین کو مضطرب و بے چین کر دیا۔ اس کا ردعمل ''پنجاب کسان سبھا''، ''ہاڑی کمیٹی'' اور ''سرحد کسان جرگہ'' کے احتجاجی مظاہروں سے واضح ہوتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان مظلوم ومحروم کسانوں اور مزارعین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر احمد ندیم قاسمی کی سربراہی میں سرگرم عمل ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے نمائندے بھی شریک رہے۔ قاسمی نے جاگیرداری نظام کے خلاف شاعری اور افسانہ دونوں سطحوں پر کھلا احتجاج کیا اور اس کا خمیازہ ''نقوش'' اور ''سویرا'' کی اشاعت کو جبراً روکنے کی صورت میں بھگتنا پڑا اور آخر کار ۹ مئی ۱۹۵۱ء میں احمد ندیم قاسمی کو قید و بند کی صعوبت بھی جھیلنا پڑی۔

دیہات کے جاگیرداری نظام کے ساتھ انہوں نے شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام پر بھی کاری وار کیا ہے۔ درحقیقت قاسمی دکھی لوگوں کے مسیحا تھے۔ وہ گاؤں اور شہر کی حدود سے ماورا ہو کر ان محروم، دکھی اور جانکاہ صدموں

سے نڈھال جسموں پر قلم سے مرہم تخلیق کر کے مسیحائی کرتے جو بہیمیت، شیطنیت، درندگی اور سفا کی کا سامنا کرتے کرتے اپنی روحوں کو گھائل کر چکے تھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''گاؤں میں زیست کرنا کتنا کٹھن ہے یہ خاص موضوع ہے قاسمی کا مگر ظلم اور جبر کی داستانیں شہروں میں بھی عام ہیں لہذا ندیم نے خود کو محض گاؤں کے ظالم جاگیردار تک ہی محدود نہ رکھا۔"۲

احمد ندیم قاسمی نے جس دیہات کی تصویر کھینچی ہے اس کے باشندے محنت و جفاکش، غیرت مند مگر معاشی و اقتصادی لحاظ سے بدحالی اور مفلسی کا شکار ہیں۔ جاگیرداری نظام میں جکڑے ہوئے کسان غربت، بھوک، سود اور بیماری جیسی تکالیف برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ احمد ندیم قاسمی چوں کہ خود گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ان کا مشاہدہ عمیق اور تجربہ وسیع تھا۔ انھوں نے محض کتابی باتیں نہیں کیں بلکہ عریاں حقیقت کو مکمل اور جامع صورت میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے دیہاتی انسانوں میں فطری حسن کے شاعرانہ بیان کا انداز بھی استعمال کیا ہے مگر ان کا اصل مطمحِ نظر دیہات کے جاگیرداری نظام، معاشی مسائل، غربت، بھوک اور طبقاتی کشمکش کو بیان کرنا ہے۔

عبدالمجید سالک ''چوپال'' کے تعارف میں رکھتے ہیں:

> ''اس کے افسانوں میں پنجاب کے غریب کسان کی زندگی کے مختلف پہلو صاف جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا عشق، اس کی جوانی، اس کی غریبی، اس کی جفاکشی، اس کی سادگی اور سب سے بڑھ کر اس کی شدتِ احساس اور یہی وہ شدتِ احساس ہے جس میں ندیم کو ثروت و افلاس، سرمایہ و محنت، حکم اور محکومی کی ٹکر کے امکانات نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے آرٹ کے خیابانوں سے نکل کر انقلاب کے ریگستان میں جوشِ جنوں کے مظاہرے کرتا ہے۔''۳

احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے ''چوپال''، بگولے، طلوع وغروب، آبلے'' ایسے مجموعے ہیں جو آزادی سے پہلے لکھے گئے ہیں۔ اور اان میں زیادہ تر افسانے جاگیرداری نظام کسانوں کے مسائل اور دیہاتی زندگی کی تصویر کو پیش کرتے ہیں۔

انیس ناگی لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ وہ ترقی پسند ادیب ہیں اس لیے وہ انسان کی تشریح اس کے ماحول سے کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر رئیلسٹ افسانہ نویس ہیں۔ اس لیے معاشرتی حقائق کی ترجمانی کو افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔''۴

افسانوی مجموعے ''چوپال'' کا پہلا افسانہ ''بے گناہ'' ایک غریب اور مفلس کسان پر ہونے والے مظالم کی داستان ہے۔ رحمان جو یتیم اور غریب کسان ہے ماں کے مرنے کے بعد بالکل تنہا دکھ بھری زندگی کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ماں

کی موت نے اسے جس تنہائی کے عذاب میں ڈال دیا وہ دن رات اس میں جھلستا رہتا۔

> ''آج اگر اس کا بس چلتا تو موت کا کلیجہ نوچ کر اسے چبا جاتا۔ اس کے تاریک پیراہن کی دھجیاں آگ میں جھونک دیتا۔ اس کے سوکھے ہوئے لمبے اور خوفناک ہاتھوں کو اپنے مضبوط پاؤں سے روند ڈالتا۔ مگر وہ ایک بے کس کسان تھا۔۔۔۔ ایک مفلس دہقان۔۔۔۔ ایک بے یارو مددگار انسان۔'' ۵

احمد ندیم قاسمی نے قدرت کی سنگدلی اور بے رحمی کو بیان کیا ہے۔ جو رحمان کو پیش آئی۔ ارضی خداؤں اور آقاؤں کے جبر وظلم سہنے کے ساتھ ساتھ کسان کو قدرت کی ستم ظریفیاں بھی سہنا پڑتی ہیں۔ اس غریب مخلوق کی زندگی میں سکون وخوشی محض سراب ہے۔ رحمان ان دکھوں پر پریشان تھا کہ جاگیردارانہ نظام کا خونی بھیڑیا ذیلدار ایک عذاب بن کر رحمان کی زندگی پر مسلط ہو گیا۔ اور لگان کا مطالبہ کرنے میں اس حقارت اور ذلت کا مظاہرہ کیا کہ غیرت مند رحمان سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور اس جابر حکمران کو سخت جواب دے دیا۔ جس کی سزا میں رحمان کے کھیت جلا دیئے گئے۔ اس کی سال بھر کی محنت ایک لمحے میں خاکستر بنا دی گئی۔ ذیلدار کی نفرت وغصہ کی آگ یہی ختم نہ ہوئی بلکہ اس نے رحمان پر جھوٹا الزام عائد کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی نے انصاف کے ٹھیکیدار پولیس کے محکمے کی بھی قلعی کھولی ہے۔ کہ چند پیسوں کے عوض یہ لوگ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حکم پر ناچنے لگتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر غریب اور بے قصور لوگوں کو جیل کی تاریکیوں میں ختم کر دیتے ہیں۔

> ''سپاہی مٹی کے برتنوں کو اٹھا کر ان میں جھانکتے اور پھر زمین پر دے مارتے۔ اس کے بوسیدہ کپڑوں سے اپنے بھدے بوٹ پونچھتے۔ چارپائیوں کو الٹتے جاتے۔ ایک نے رحمان کے گڑ کا برتن توڑ کر سب کچھ اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ اس چار دیواری میں ایک قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پولیس کے یہ سپاہی بھوکی گدھیں ہیں جو ایک گلی سڑی لاش پر جھپٹ جھپٹ کر اس کی ہڈیوں کا گودا تک نوچ رہی ہیں۔ رحمان خون کے گھونٹ پی رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ انصاف کے ٹھیکیدار اس کی محدود جمع پونجی کو تباہ کیے جا رہے ہیں۔'' ۶

معصوم غریب کسان کو اپنے حق کے لیے آواز نکالنے کی سزا یہ ملی کہ سب کچھ تباہ کرنے کے بعد رحمان کی قسمت میں دو سال قید با مشقت لکھ دی گئی اور جیل میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد رحمان شدید بیماری کی حالت میں گاؤں لایا گیا جہاں وہ موت کے ابدی سکون میں سو گیا۔ احمد ندیم قاسمی نے غریب کسان کا دردناک حال یوں بیان کیا ہے کہ حقیقت بھی تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے جاگیردار کے مظالم، لگان کے اذیت، حقارت اور نفرت، جاگیرداروں کے کارندوں کے مظالم ان سب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

افسانہ ''غیرت مند بیٹا'' میں احمد ندیم قاسمی نے کسان کی رگوں میں جاگتی غیرت اور انا کو بیان کیا ہے اور جاگیرداروں، زمینداروں اور ٹھیکیداروں کی وہ حقارت اور نفرت کی تصویر بھی کھینچی ہے جس کا حقدار وہ غریب کسانوں اور مزدوروں کو سمجھتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ایک ایسے کسان کی غیرت وخودی کو بیان کیا ہے۔ جو بھوک سے مر تو گیا

مگر کسی کے آگے جھکا نہیں، افسانہ نگار نے اس نقطے کو واضح کیا ہے کہ کسان دن رات محنت کرتا ہے۔ کھیتوں کو اپنے خون سے سینچتا ہے، گاؤں کے آقاؤں کی خدمت کرتا ہے، مگر بدلے میں اسے کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے۔ اس کی ساری محنت جاگیردار کے گھر کی دولت میں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ اور غریب کی بھوک میں، ایسا ہی ایک غریب غیر مند کسان بھوک سے مر گیا مگر جھکا نہیں۔ اس کی بیوی اپنے اکلوتے بیٹے کو زندگی کا درس دیتی ہے کہ باپ کی طرح غیرت مند بننا بھوکے مر جانا مگر کسی کے پاؤں میں نہ جھکنا۔

> ''تمھارا باپ غیرت والا مرد تھا۔ اس نے کسی کے پاؤں نہیں چومے۔ اس نے کسی کی خوشامد نہیں کی، اس نے سر پر ٹوکریاں اٹھائی ہیں۔ پیٹھ پر دو دو من کی بوریاں لاد کر اونچی اونچی سیڑھیوں پر چڑھا ہے۔ پتھریلی اور سخت زمینوں میں ہل چلائے ہیں۔ لیکن اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ اسی نے دکھ بھوگے ہیں۔ لیکن وہ رویا نہیں۔'' ۷

غیرت مند باپ کا بیٹا جب زمیندار کی ملازمت کرنے گیا۔ ماں کے ساتھ چکی پیسنے گیا۔ ہل چلانے گیا تو ہر جگہ اسے معلوم ہوا کہ غریب کو غیرت سے رہنا مشکل نہیں ناممکن بھی ہے۔ ہر جگہ اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ماں سارا سارا دن چکی پستی مگر دام پورے نہ ملتے۔ وہ زمیندار کا ہل سارا سارا دن چلاتا مگر بدلے میں حقارت اور ذلت ملتی۔ جاگیرداری و سرمایہ داری نظام میں کسان اور مزدور سب ذلت کے پتلے ہوتے ہیں۔ جب زمیندار کے تذلیل آمیز رویے کی وجہ سے غیرت مند کسان کے بیٹے نے نوکری چھوڑنے کی بات کی تو زمیندار سوچنے لگا۔

> ''زمیندار تو جہاں کھڑا تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ جو شخص بغیر حیل و حجت کے دو روپے ماہوار پر نوکری کرنے پر رضا مند ہو جائے، وہ مالک سے ناراض ہو کر چل دے تو کیا اسے مرنے کا خوف نہیں ہوتا؟ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کیا غریبوں کو بھی غیرت کا احساس ہوتا ہے؟ کیا یہ بھی سوچ سکتے ہیں؟ کیا مفلسی غیرت اور سیرت کا خون نہیں کر دیتی؟'' ۸

احمد ندیم قاسمی نے نہایت چابکدستی سے اس نقطے کو واضح کیا ہے۔ کہ غریب غیرت اور عزت سے رہنا بھی چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ دولت مند اور اہل ثروت ان غریبوں کو حقیر رینگنے والے کیڑے سے زیادہ درجہ نہیں دیتے۔ غیرت مند باپ غیرت کی سزجھیل کر بھوک سے مر گیا اور آگے بیوی اور بیٹے کا انجام بھی یہی دکھائی دیتا ہے۔ ماں افلاس اور غربت کے ہاتھوں موت کے بستر پر پڑی ہے۔ اور غربت ان کا مذاق اڑا رہی ہے۔ آخر مرتی ماں کو اس حالت میں بیٹا نہ دیکھ سکا اور حکیم سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔

مگر غیرت مند ماں حکیم کی دوا سے پہلے ہی بھیک کے ان چند قطروں سے منہ موڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

افسانہ ''بے چارہ'' بھی گاؤں کے جاگیرداری نظام میں جکڑے ایک مزدور کی کہانی ہے جو ذیلدار کے پاس بیگار کرتا تھا۔ ذیلدار کا ہر حکم ماننا اس کے لیے ضروری تھا۔ افسانہ نگاروں نے اس پہلو کو بیان کیا ہے کہ جب ان زمینداروں جاگیرداروں کے پاس کوئی سرکاری افسر اور ضلعی افسر آتا تو ان کی خاطر مدارت میں غریب کسان

اورمزدور پس کررہ جاتے۔ ایک ضلعی افسر کے آنے پر اس بے چارے مزدور کا کام تھا کہ مرغے اور انڈے مہیا کرے۔ کبھی تھانیدار کی خدمت، کبھی ضلعی افسر کی خاطر مدارت اور کبھی سرکاری عہدے داروں کی بیگار، یہ گاؤں کے غریب کسان مزدور تو بے دام غلام تھے جن کا مقصد خدمت کرنا ہی تھا اور جاگیردار کے حکم پر انھیں یہ سب کام کرنا ہوتے۔ بے چارہ غریب مزدور کئی میل سفر کر کے سرکاری بنگلے مرغے فراہم کرنے کے لیے صبح سویرے نکلا۔

> ''وہ حیران تھا کہ حصہ ضلع کا پیٹ اتنے مرغے کھا کر پھٹ کیوں نہیں جاتا؟ مرغے کا گوشت تو گرم ہوتا ہے! اس کا دماغ نہیں چکراتا؟ کہیں اسے دورے میں یرقان کی شکایت نہ ہو جائے!۔۔۔۔ اسے کیا معلوم کہ حصہ ضلع کے چیلے چانٹے بکروں کو نگل جاتے ہیں، مرغے تو پھر مرغے ہیں۔''۹

مزدور خوش تھا کہ آج اس لڑکی نے جس سے وہ محبت کرتا تھا اسے چٹان کے پاس ملنے کا وقت دیا تھا خوشی خوشی وہ سرکاری بنگلے پہنچتا ہے مگر سرکاری افسر نے اسے حکم دے دیا کہ کئی میل دور سیکسر کی چوٹی پر دوسرے افسر کو رقعہ دے کر آؤ اور جوابی پیغام واپس اسے دے کر جائے۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کو بیان کیا کہ غریب انسان کی کوئی خوشی ان جاگیرداروں سرمایہ داروں کے نزدیک وقعت نہیں رکھتی۔ ان کا کام ان لوگوں کی خوشیوں، عزت اور ناموس کو پامال کرنا ہی ہے۔ وہ غریب انسان بھاگ دوڑ کر اس افسر کے بنگلے تک پہنچا اور دل میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھرتا رہا مگر کچھ کر نہ سکتا تھا۔

> ''وہ بھاگنے لگا۔ دو ایک جگہ اصل رستہ چھوڑ کر جھاڑیوں اور چٹانوں سے لٹک کر تیزی سے نیچے اترا، مگر اب اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر سرد بایا یہ افسر لوگ سبھی کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا!۔۔۔۔ ناسمجھ خود غرض انسان! متکبر ریا کار لوگ۔۔۔۔!''۱۰

ظلم تو یہ کہ جب کئی میل سفر طے کر کے اپنی محبت کو پیچھے چھوڑ کر اس معصوم لڑکی کے جذبات کا خون کر کے رقعہ منزل تک پہنچایا تو جوابی رقعہ اس نے یہ لکھوایا کہ موسیٰ خیل سے کچھ مرغے لے آئے۔ قاسمی نے ایک غریب معصوم دیہاتی انسان کی ان جاگیرداروں اور سرکاری سرمایہ داروں کے ہاتھوں استحصال کی داستان کو بیان کیا ہے۔

> ''اس کے پلکوں پر لرزے ہوئے، دو موٹے دو موٹے آنسوؤں کو پونچھا اور سر جھکائے موسیٰ خیل کی طرف چل پڑا۔۔۔۔ بے چارہ''۱۱

افسانہ ''دیہاتی ڈاکٹر'' بھی دیہات کے مصیبت زدہ لوگوں کی کہانی ہے، دیہات کے وہ لوگ جو تمام عمر جاگیرداروں کے خونی پنجوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ بھوک، حقارت اور بیماری کا لبادہ اوڑھے یہ حقیر رینگنے والے کیڑے زندگی کو اس ڈھب پر جینے پہ مجبور ہیں مگر بے رحمی کی انتہا تو یہ ہے کہ ان غریب لوگوں کے لیے موت بھی آسان نہیں ہے۔ بیماریوں میں مبتلا یہ غریب لوگ علاج کے لیے ترستے ہیں اور اگر خیراتی ہسپتال میں قسمت سے کوئی ڈاکٹر آ جائے تو وہ اپنی فرعونیت میں ان جاگیرداروں اور زمینداروں سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے ایسے ہی

ایک دیہاتی ڈاکٹر کی ظلم کی داستان سنائی ہے جو غریب کسانوں پر جابرآقا بن بیٹھا تھا لاکھ منتوں بعد نسخہ لکھتا اور کمپاؤنڈر رشوت لیتا تب دوا دیتا اور اگر کسی کے پاس پیسہ نہیں اناج نہیں کچھ دینے کو نہیں تو اس کا مریض ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا۔ گاؤں میں کچھ پڑھا لکھا ایک نوجوان جب اپنے مریض کے لیے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گیا تو وہ ان سب حالات و واقعات دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ایک کسان نے اسے خیراتی ہسپتال اور اس کے ڈاکٹر کمپاؤنڈر کے حالات بتائے۔

> ''آج کل ہسپتال پر حریصوں کا راج ہے۔ میں نے چار دن ہوئے شہر میں دونی کی سبزی بیچی تھی، وہی پیش کر کے روٹھے کو منایا۔۔۔۔ کوئی چار قطرے بوتل میں ٹپکا دیئے اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر برآمدے میں دھکیل دیا۔''۱۲

احمد ندیم قاسمی نے افسانے میں واضح کیا ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام نے مادیت پرستی کی پٹی ان سرمایہ داروں کی آنکھیں پر باندھ دی ہے۔ جس کے باعث بینا ہوتے ہوئے بھی نا بینا ہو چکے ہیں۔ اپنے عہدے، پیشے اور کام سے ایمانداری کے بجائے ہوس پرستی میں گم ہو چکے ہیں۔ جب اس باشعور دیہاتی نے ڈاکٹر کے ساتھ سختی کا مظاہرہ کیا اور غریب مرتے لوگوں کا معائنہ کرنے اور دوا دینے پر مجبور کیا تو اس کا خمیازہ اس شخص نے یہ بھگتا کہ ڈاکٹر نے اس کے ساتھ جا کر مریض کو چیک کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر وہ مریض دنیا سے رخصت ہو گیا۔

قاسمی نے اس پہلو کی عکاسی بھی کی ہے۔ کہ دراصل جاگیردارانہ نظام میں ان جیسے بھیڑیوں کو جاگیرداروں، زمینداروں اور اہل رسوخ طبقہ کی پست پناہی حاصل ہوتی ہے۔ چناں چہ یہ لوگ بلا جھجک غرباء، کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔

چوپال کے بعد ''بگولے'' مجموعہ بھی احمد ندیم قاسمی کا شاہکار مجموعہ ہے۔ جس میں دیہاتی زندگی اپنی مکمل حقیقی شکل میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔ کرشن چندر ''بگولے'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''یہی وہ سماج کا ظالمانہ چکر ہے جس کے بگولے دیہات کے میدانوں میں اڑتے ہیں۔ جنھوں نے کسانوں کے گھروں اور چوپالوں کو کھنڈر بنا دیا ہے اور ان میں انسانوں کی بجائے زندہ بھوت اور غول بیابانی آباد کر دیئے ہیں۔ اگر احمد ندیم قاسمی چیخ سکتا تو ہر افسانے کے اختتام پر چلا کر کہا ''بچاؤ، بچاؤ'' ہندوستان کے دیہاتوں کو اس خودکشی سے بچاؤ۔ لیکن احمد ندیم قاسمی ایک کسان ہے وہ چیختا نہیں وہ اپنے انتقام کی خاموش آگ اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں منتقل کر دیتا ہے۔''۱۳

مجموعے کا پہلا ہی افسانہ ''طلائی مہر'' کسانوں کے استحصال اور ان پر ہونے والے ظلم و تشدد کی داستان ہے۔ افسانہ نگار نے جاگیرداروں، زمینداروں اور ان کے کارندوں کے ظالمانہ رویے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں شامل ایک اور کردار کو بے نقاب کیا ہے وہ تھانیدار کا ہے۔ وہ ان جاگیرداروں کے ساتھ مل کر غریب کسانوں پر قہر بن کر ٹوٹتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے واضح کیا ہے کہ خود تو انصاف کے ان ٹھیکیداروں میں اتنی اہلیت نہیں ہے کہ وہ مجرموں کو پکڑ

سکیں سارا سارا دن اور تمام رات عیش و عشرت میں مگن غریب دیہاتیوں سے غصب کی گئی دولت پر چین کی بانسری بجاتے اور چوروں ڈاکوؤں کو چھپانے کا جھوٹا الزام دیہاتیوں پر دھر کر ان کو بے موت مرنے کا سامان کرتے ہیں۔ اس افسانے میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ میں یہ بتایا گیا کہ یہ تھانیدار غریب و مجبور کسانوں سے ہر مہینے ایک مخصوص رقم لیتے جس کا ادا کرنا ہر کسان پر واجب تھا۔ وہ بیمار ہو، بیوہ ہو، یتیم ہو، کوئی بھی اس کی ادائیگی کے بغیر چھوٹ نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے غریب باپ اپنی بیٹی کی عزت بیچنے پر مجبور ہوا۔ مگر وہ رقم دیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے اس نقطے کو بیان کیا کہ ایک طرف تو جاگیردار لگان کی صورت میں کسان کو نچوڑتا، دوسری طرف منشی مہاجن قرضہ اور سود کی تلوار گردن پر تانے رکھتا۔ کبھی تھانیدار پیسے بٹورتا اور کبھی مذہبی پیشوا ان غریب لوگوں کا جینا عذاب کیے رکھتا۔ غرض کسان کبھی بھی سکوں کا سانس نہ لے سکتا۔ ''طلائی مہر'' میں تھانیدار چوروں کو پناہ دینے کا الزام عائد کر کے غریب کسانوں کو حکم دیتا ہے کہ ایک مہینہ وہ اپنی زمینوں اور فصلوں پر ہل نہیں چلا سکتے۔ اور نہ ہی پانی دے سکتے ہیں۔ تمام رحم کی اپیلیں تھانیدار مسترد کرتا ہوا اپنا آخری حکم نافذ کرتا ہے۔ اس کے لہجے میں رعونت اور حقارت فرعونیت کو مات دے رہی تھی۔

> ''تم غریب ہو تو یہ تمھارے اپنے ماتھے کا لکھا ہے۔ تم سب اپنے جھونپڑے چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک مہینے تک نہ ہل چلاؤ، نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرو، نہ گوبھی کو پانی دو، ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔۔ ایک بوڑھا کھوسٹ پرلی طرف سے ایک بیری کے تنے کا سہارا لے کے اٹھتے ہوئے بولا۔ ہم پر رحم کیجیے، ہم پر رحم کیجیے مالک! اور تھانیدار پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ میں کیا جانوں رحم کون بلا ہے۔ میں رحم کرنا نہیں جانتا۔ میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے!''[۱۴]

فیض جو ایک نوجوان کسان ہے اور ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے وہ اسے سونے کی طلائی مہر خرید کر دینا چاہتا ہے۔ محبت کا یہ جذبہ تھانیدار سے بغاوت کا پیغام بن جاتا ہے۔ اور وہ اس کے حکم کے باوجود اپنے کھیتوں اور گوبھی کے پھولوں کو پانی دیتا رہتا ہے اور اتنی رقم اکٹھی کر لیتا ہے جس سے ایک طلائی مہر بنوا سکے۔ جب وہ اپنی محبوبہ کو وہ طلائی مہر دینے جاتا ہے تو راستے میں اسے تھانیدار اور اس کے سپاہی اسے جرم کی پاداش میں مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے اس دردناک حقیقت کو واضح کیا ہے کہ غریب کسان اس جاگیرداری استحصال کے ساتھ تھانیداروں کا ظلم بھی سہتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار احمد ندیم قاسمی کے افسانہ کے آغاز میں ہی کر دیتے ہیں۔

> ''ہڈیاں چیخیں، پسلیاں چرچرائیں اور سوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں،
>
> ''ایسا نہیں ہو سکتا!،
>
> ''اور اب پٹواریوں، جاگیرداروں اور نمبرداروں کے ہجوم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کا زاوے بدلتے ہوئے نکلا اور کڑکا، ایسا ضرور ہوگا! یہ میرا حکم ہے۔''[۱۵]

یہ الفاظ اس بات کو گواہی دیتے ہیں کہ یہ سب لوگ ایک ہیں، اور اس جاگیرداری نظام کو چلانے والے آقا ہیں جو

غریب کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔

افسانہ ''کھیل'' بھی جاگیرداروں کے غیر انسانی سلوک اور ظلم کا عکاس ہے۔ جاگیردار جو غریب عوام کو اپنے پاؤں تلے روندنے کا عادی ہوتا ہے آگے اس کی اولاد اسی نقشِ قدم پر چلتی ہے اور یوں یہ ظلم وستم کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ غریب دیہات کے لوگوں کو ان جاگیرداروں کے ہاتھوں اپنی جان ، مال ، عزت اور آبرو کو محفوظ رکھنا ناممکن سی بات تھی۔ غریب چرواہا جو اپنی بیوہ معصوم بیٹی کا واحد سہارا ہے مگر بیماری نے اسے بے بس کر دیا دوا کے لیے پیسے نہیں۔ غریب کی مدد کرنے کے بجائے جاگیردار کا بیٹا اس دکھی غمزدہ بیوہ رانی کی عزت و آبرو کا دشمن بن جاتا ہے۔ جب بھی راہ میں ملتی وہ دست درازی کرتا مگر غریب مجبور لڑکی اپنی بے عزتی پر آواز نہ نکال سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ

> ''وہ ایک بیوہ ہے اور اگر بیوہ کا دوپٹہ اندھیری گلی میں کھینچ لیا جائے تو سب اسی کو کوسیں گے اور پھر ان سب حرکتوں کے پیچھے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ جس کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔۔ جو گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش ہونے کے باوجود عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا!'' [۱۶]

احمد ندیم قاسمی نے واضح کیا کہ غریب انسان کی عزت کی کوئی قیمت نہیں یہ جاگیردار جب چاہیں اس کی عزت کو داغدار کر دیں اپنے قدموں تلے روند دیں۔ باپ کی بیماری کی وجہ سے جب کوئی چارہ نہ رہا تو آخر ایک دن رانی جنگل سے لکڑیاں چننے چلی گئی تا کہ انھیں بیچ کر بھوک کی تکلیف سے بچا جا سکے۔ مگر وہاں جاگیردار کا بیٹا جنگل کے داروغہ کو ساتھ لے کر آیا اور اس سے زبردستی ایک کاغذ پر انگوٹھا لگوا لیا کہ وہ چور ہے اور اگر اس جرمانے سے بچنا چاہتی ہے تو کل اس وقت وہ اسے ملے تا کہ وہ اپنی ہوس کی آگ بجھا سکے۔ مگر اگلے دن جب جاگیردار کا بیٹا اس جگہ گیا تو

> ''اس نے دیکھا کہ رانی ایک چٹان سے سر پھوڑے مری پڑی ہے۔ خشک لکڑیوں کا گٹھا پاس دھرا ہے اور کالا انگوٹھا رات کی ٹھنڈ میں یوں اکڑ گیا ہے جیسے لپک کر نوجوان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دے گا۔'' [۱۷]

ایک معصوم بے قصور لڑکی اپنی عزت کی حفاظت نہ کر سکتی تھی جاگیردار کی ہوسناک نگاہوں سے چھپ نہ سکتی تھی مگر موت کی آغوش میں وہ ان تمام دکھوں سے بے نیاز ہو گئی۔ ایک غریب لڑکی مرنے پر مجبور کر دی گئی۔ اور نہ جانے دیہات کی کتنی معصوم جانیں ان بھیڑیوں کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اس حقیقت کی عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانوی مجموعہ ''طلوع و غروب'' بھی جاگیردارانہ استحصال کی سچی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس مجموعے کا افسانہ ''کنگلے'' گاؤں کے غریب وستم زدہ لوگوں کی دکھی زندگی کو پیش کرتا ہے یہ لوگ جہاں جاگیرداروں ، زمینداروں ، مہاجنوں ، منشیوں اور ان کے کارندوں کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں وہاں قدرتی آفات بھی ان کی رہی سہی امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔ گاؤں میں کافی عرصہ بارش نہ ہونے کے سبب فصلیں

تباہ ہوگئیں۔ کنویں خشک ہوگئے۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہونے لگا۔ قحط پیدا ہوگیا، لوگ کئی میل دور کھڑی گندی جھیل کا پانی پینے پر مجبور ہو گئے، ایسے میں گاؤں کا کرسی نشین جو گاؤں کا مالک بنا بیٹھا ہے اپنے کنوئیں سے کسی پیاسے کو پانی کی ایک بوند لینے کی اجازت نہ دیتا اگر کوئی فاقوں مرتا انسان اس سے گیہوں یا اناج مانگتا تو جواب میں حقارت ملتی، سب لوگ اس جاگیردار کرسی نشین سے مایوس ہو کر سوچنے لگے کہ صاحب ضلع کے پاس چلے جائیں شاید مرتے لوگوں کو زندگی مل جائے۔

> ''وہاں ایک بوڑھے نے ایک تجویز پیش کر رکھی تھی کہ صاحب کے پاس سارے کا سارا گاؤں چلا جائے اور ہاتھ جوڑ کر پکارے کہ ''ان داتا'' ہماری بھی کچھ فکر کر۔ ہم تیری پرجا ہیں، ہم پیٹ پر پتھر باندھے تھک گئے ہیں۔ انتڑیاں رسیاں بن گئی ہیں۔ بیٹھ جائیں تو اٹھا نہیں جاتا، سانس لینا بھی عذاب ہے، میں نے سنا ہے کہ صاحب ضلع دیسی ہے۔ دیسی بھائی ہماری فریاد سمجھے گا، شاید ترس کھا کر کوئی علاج کر ڈالے ہمارے مصیبتوں کا'' ۱۸؎

افسانہ نگار نے اس بے رحم حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ معصوم غریب دیہاتی ان جاگیرداروں، سرمایہ داروں سے محض امید ہی کر سکتے ہیں جو مایوسی میں بدل جاتی ہے وہ امید کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ ہر صاحب اقتدار اور طاقت رکھنے والا انسان اپنی حیثیت کے مطابق ان غریبوں کا استحصال کرتا رہتا ہے۔ قحط سے مرتے لوگوں کو دیکھ کر سرکار نے ایک سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا تاکہ مزدور دہقانوں کو پانچ آنے روزانہ مزدوری دے دیں۔ جس سے وہ مرنے سے بچ سکیں۔ پورا گاؤں ٹوٹ پڑا مگر محنت کے بعد انھیں اٹھنی ملی اور بقیہ پیسے ٹھیکیدار نے ہضم کر لیے اور جب دن رات بھوکے وجود کے ساتھ کام کرتے کسان گھر لوٹے تو کرسی نشین نے اسی ضلع صاحب کی آمد پر گاؤں کی سجاوٹ کرنے کی خاطر ان سب سے اٹھنی لے لی یوں بھوکے مرتے لوگ کبھی جاگیردار کے ہاتھوں لٹتے اور کبھی سرمایہ داروں کے استحصال کا نشانہ بنتے۔

> ''مضمحل ہاتھ پگڑیوں کے کنارے کی طرف بڑھے اور دو اٹھنیاں کھنکتی ہوئی کرسی نشین کے زریں جوتوں کے پاس آگریں۔'' ۱۹؎

اس موضوع پر ایک اور افسانہ ''جلسہ'' ہے۔ جس میں احمد ندیم قاسمی نے اس نکتے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار بھی غریب دیہاتیوں کا خون چوسنے میں برابر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ غریب کسان جس کی زندگی کا مقصد پورا پورا دن کھیت میں ہڈیاں رگڑنا، محنت کرنا اور پوری پوری رات مہاجن کے قرض، بھوک اور آئندہ آنے والے حالات کے خوف سے جاگتے رہنا ہے۔ اسے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بڑی بڑی باتیں سے کیا غرض مگر یہ جاگیردار اور سرمایہ دار ان معصوموں کو لوٹنے کے سب حربے جانتے ہیں۔ یہی کچھ اس افسانے میں بیان کیا گیا۔ ایک غریب قصبے میں بڑے بڑے سرمایہ داروں اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے اپنا جلسہ منعقد کیا جس میں سوکھے جسموں، بے روح اجسام، خالی بنجر آنکھیں اور خاک اڑاتے لباسوں والے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی۔ کیوں کہ وہ مجبور تھے، بے بس تھے، لاچار تھے، اس جلسے میں تشریف لانے والے مہمانوں

کی خاطر مدارت اور ان کے لیے آرائش و زیبائش کے انتظامات کے لیے چندہ بھی انھی غریب دیہاتیوں سے اکٹھا کیا گیا۔ جلسے میں تقریر کرنے والوں میں ایک مذہبی پیشوا تھا۔ جس کی تقریر کا مقصد اپنے والد کے عرس کے لیے چندہ جمع کرنا اس کے آستانے پر حاضری اور چڑھاوے کے لیے سادہ لوح دیہاتیوں کو مائل کرنا اور مذہب کی آڑ میں غریب لوگوں کو بہکار پیسہ بٹورنا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور سرمایہ دار، بھیڑیا زور شور سے اپنا مدعا بیان کرنے آیا تھا۔ جو عوام کا درد اپنے دل میں اس قدر رکھتا تھا کہ ایک آشرم بنا رہا تھا اور اس کے لیے چندہ اگانے آیا تھا۔ وہ نام نہاد آشرم دراصل پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ تھا۔ ایک تیسرے صاحب جو اسمبلی کے ممبر تھے وہ اپنے آئندہ الیکشن میں اپنے ووٹ کھرے کرنے کے لیے تشریف لائے تھے مگر ظلم تو یہ کہ عملی طور پر ایسا کچھ بھی نہ تھا اور جب دیہاتی لوگوں نے اپنے مسائل بتانے کے لیے زبان کھولی تو انھیں خاموش کروا دیا گیا۔

> ''جب اسمبلی کے ممبر صاحب اٹھے تو تمام جلسہ میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ ہماری سڑک برباد پڑی ہے، ہمارے لیے پانی کا انتظام نہیں، ہماری فصلیں تباہ ہوگئی ہیں، مگر لگان معاف نہیں ہوا۔ تھانیدار ہمیں پکڑ کر تنگ کرتا ہے، لیکن ایک بوڑھے نے چپکے سے یہ نشتر سب کے دلوں میں چبھو دیا کہ ملک بڑا آدمی ہے اشارہ کر دے تو تم سب حوالات میں گلتے سڑتے نظر آؤ، رہنے دو انھی سڑکوں، فصلوں کو، تقریریں سنو اور اللہ کی قدرت دیکھو! ، اور اچانک تمام مجمع پر سکوت چھا گیا۔''۲۰

احمد ندیم قاسمی نے اس افسانے میں اس پہلو کو واضح کیا ہے کہ جاگیردارانہ استحصالی قوتوں کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار لوگ بھی ان مجبور لوگوں کو تباہ کرنے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان گدھوں کی مانند ہیں جو مرتے ہوئے شکار کی ہڈیوں سے آخری بوٹی تک نوچ لیتے ہیں۔۔ جاگیردار کے ساتھ مل کر یہ سرمایہ دار ہستیاں جن میں مذہبی، سماجی اور سیاسی شخصیات شامل تھیں وہ ان غریب، مجبور لوگوں سے اکٹھا کیے گئے چندے سے پان، سگریٹ اور اعلیٰ کھانوں میں مست پر زور تقاریر کرتے رہے مگر کسی نے ان بھوکے، پیٹ پر پتھر باندھے بے بس بیٹھے ہوئے نحیف و لاغر اجسام پر توجہ نہ دی جو خاک اڑاتی زمین پر بیٹھ کر پھولوں سے سجی کرسیوں پر زرق برق لباس پہنے پان و سگریٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آقاؤں کو سلامی پیش کر رہے تھے۔ افسانہ نگار نے ان لوگوں کی گلی سڑی روحوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو بظاہر خوبصورتی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ مذہبی رہنما، مذہب کا ٹھیکیدار، مولوی جب تقریر کے لیے اٹھا تو ایک پاگل شخص اس کو دیکھ کر چیخا اور مارنے کو دوڑا مگر اسے پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔ یہ شخص وہ بدقسمت باپ تھا جس کی بیٹی کی عزت کو اس مولوی نے لوٹ لیا تھا۔ کیوں کہ اس کا باپ اس کی آمد پر چندہ ادا نہ کر سکا تھا۔ پندرہ سولہ سال پہلے یہی مولوی جب گاؤں میں آیا تو گاؤں کے ذیلدار نے اس کی آمد پر چندہ اکٹھا کیا مگر یہ غریب انسان ادا نہ کر سکا اس کی سزا میں جاگیردار کے کارندوں نے اس کی بیٹی مولوی کی خدمت میں پیش کر دی۔

> ''بوڑھا آگے بڑھتا گیا اور ذیلدار سے جا کر پوچھا کہ میری لڑکی کہاں ہے، اور ذیلدار نے بتایا

کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس ہے اور تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ تیری لڑکی اپنا کنوارہ پن لگا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے! بوڑھے نے چیخنا چاہا مگر ذیلدار کی لٹھ سیدھی اس کے دماغ پر پڑی۔۔۔۔۔اس دن سے اس کا دماغ چل گیا ہے"۔۲۱

احمد ندیم قاسمی نے افسانے میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔

اسی مجموعے کا افسانہ "میرا دیس" بھی جاگیردارانہ استحصال اور اس نظام کی جبریت کی عکاسی کر رہا ہے۔ افسانہ نگار نے دیہات کے باطن میں چھپے ان ناسوروں کو چھیڑا ہے جنھوں نے دیہات کی سرزمین کو گندے فاسد مواد سے بھر دیا ہے۔ اس زخم کو کریدا ہے جو غریب کسانوں کے جسم اور روح کو لہولہو کر گیا ہے۔ زمیندار جو گاؤں کی کل کا ملک ہے جب چاہتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنے ظلم کو شکار بناتا ہے۔ ایک غریب کسان جس کی زمین قرق ہو چکی ہے اور زمیندار نے اسے ایک بیگھہ زمین کاشت کے لیے دی ہے مگر بدلے میں وہ اس کی نوجوان بیٹی کو ہر روز اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ غلام ہیں، بے زبان ہیں، زمیندار کے محتاج ہیں، وہ اس ظلم پر بول نہیں سکتے چیخ نہیں سکتے کیوں کہ انھیں زندہ رہنا ہے۔ سانس لینا ہے، مگر غریب، لاچار اور مجبور لڑکی جو زمیندار کی بھینٹ کا نشانہ بنتی ہے۔ دل میں ان سب کے خلاف نفرت اور حقارت کا شدید جذبہ رکھتی ہے وہ سوچتی ہے کاش میں ان سب کو ختم کر سکوں اس نظام کی دھجیاں بکھیر دوں، مگر کاش! ایسا وہ صرف سوچ سکتی ہے۔

"اور اچانک اسے اپنا وجود ایک انگارے کی شکل اختیار کرتا محسوس ہوگا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ یہ انگارا کب پھوٹیگا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمینداروں، ان مولویوں اور ان پیروں کے ریشمیں ملبوس میں کالے کالے سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں، ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں! صبح تک یہ انگارہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ پھر اٹھے گی، وہی گھاس کا گٹھا ہو گا اور وہی جوتوں کی چیتھڑوں کی آڑی سیدھی لکیر، وہی پھٹا ہوا چولا وہی جھلکتی ہوئی چھائیاں! یہ انگارہ یوں ہی تپے گا۔ ٹھنڈا ہوگا، تپے گا، ٹھنڈا ہوا اور زمیندار کے شبستان میں اسی طرح۔۔۔۔۔۔"۲۲

احمد ندیم قاسمی نے بے بسی اور اذیت کی اس انتہا کو بیان کیا ہے جو ان بدقسمت لوگوں کا مقدر ہے۔ وہ لوگ جان چکے ہیں کہ یہ نظام بدل نہیں سکتا، انھیں اس استحصالی نظام سے سمجھوتا کرنا ہوگا۔ افسانہ نگار نے طبقاتی کشمکش کو بھی اس افسانے میں بیان کیا ہے۔ کہ مولوی جو سبق اور درس مسجد میں دیتا ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ مگر عملی طور پر ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مسلمان محض دکھاوے کے مسلمان ہیں اصل تو دین، مذہب، عقائد، اصول سب کچھ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مطابق بنتے ہیں۔ ان کا حکم ہی دین ہے اور ان کی ایک جنبش سب قانون بدل دیتی ہے۔ جب کسان کی مظلوم بیٹی اپنی بدحالی پہ ماتم کرتی ہے اور سوچتی ہے۔

"اری تو کس ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی کہ تجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی، کس گناہ کی پاداش میں تجھے دنیا کے اس دوزخ میں جھونکا جا رہا ہے۔ پرسوں مولوی وعظ میں کہہ رہا تھا کہ

سب انسان بھائی بھائی ہیں۔۔ ۔۔تو زمیندار میرے باپ کو گھر کتا کیوں ہے، میرا باپ
زمیندار کو کیوں نہیں گھر ک سکتا۔'' ۲۳

احمد ندیم قاسمی کا شاہکار افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' ان کے لازوال افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں جہاں جنگ سے آنے والی تباہی اور اس کے مسائل کا ذکر ہوا ہے وہاں جاگیرداری نظام، مہاجنی نظام اور کسانوں کی غربت کا بھی بیان ہوا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار شمشیر خان اپنے نوجوان چند دن کے بیاہے بیٹے کو محاذ پر بھیجنے پر مجبور ہے۔ انگریزوں نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو ہندوستانی نوجوانوں کی کثیر تعداد محاذوں پر لے جائی گئی۔ بوڑھا شمشیر خان جو قرض کی دلدل میں پھنس چکا تھا اور مہاجن کے خون آشام پنجے اسے اپنی گردن پر محسوس ہوتے ہیں تو وہ گھبرا کر اپنے بیٹے کو جنگ لڑنے بھیج دیتا ہے۔ تاکہ ان پیسوں سے وہ مہاجن کے چنگل سے نکل سکے۔ افسانہ نگار نے اس بے رحم حقیقت کو پیش کیا ہے کہ مہاجن کے سود در سود قرض کا سلسلہ اس قدر بھیانک ہوتا ہے کہ دیہات کے غریب لوگ اپنے اور اپنے بچوں کی جانوں سے بے نیاز ہوکر نہ جانے دل پر کونسا بھاری پتھر رکھ کر انھیں سنسناتی گولیوں اور اٹیم بم کے دھماکوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

''جب وہ گھر آتا تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر
اس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آنکلتا اور اندھیرے میں سوکھے پتے اس کی طرف لپکتے
اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔'' ۲۴

احمد ندیم قاسمی نے جاگیرداروں کے استحصال اور غاصبانہ رویے کو بھی بیان کیا ہے۔ دریائے سندھ میں سے بہت بڑی نہر نکال کر جاگیرداروں اور نوابوں کی زمینوں کو سیراب کیا جا رہا تھا۔ جبکہ باقی گاؤں اور غریب کسانوں کی زمینیں آہستہ آہستہ بنجر اور ویران ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ جس سے قحط اور تباہی کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ شمشیر خان کو جاگیرداروں کے اس استحصال پر افسوس اور دکھ ہوتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی بنجر اور سوکھی فصلوں کی دیکھتا، بھوکے لوگوں اور نڈھال جانوروں کو دیکھتا تو اسے عنقریب آنے والی تباہی کے مناظر آنکھوں میں کھومنے لگتے۔

سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا۔ جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا کہ کچھ پلے نہیں پڑتا، کہ ایک ہزار
غریب کسانوں کی زمین اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے؟'' ۲۵

احمد ندیم قاسمی نے نہایت خوبصورتی سے برطانیہ اور جرمنی کی جنگ اور جاپان کے شہر ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم کی تباہی کے تناظر میں ہندوستان میں ہونے والی تباہی کو بیان کیا ہے۔ اور اس ملک کے اندر جو ہر لمحہ جاری رہنے والی اقتصادی، سیاسی اور مذہبی جنگوں کے پیدا کردہ مسائل، بھوک کی جنگ، جاگیردارانہ نظام کی جنگ، سرمایہ داروں کی جنگ، قحط کی جنگ، حرص و ہوس کی جنگ اور جمہوریت کی جنگ اور ان کے اثرات کو پیش کیا ہے۔ فتح محمد ملک اس افسانے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''احمد ندیم قاسمی نے یوں تو اپنے متعدد افسانوں اور اپنی ذہنی نشوونما کے اہم موڑ پر جنگ کی ماہیت اور اثرات پر تخلیقی غور وفکر کیا مگر طویل افسانہ ''ہیروشیما کے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' میں انھوں نے اپنے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو جس ہمہ گیر انداز میں اور جس فنکارانہ صناعی کے ساتھ پیش کیا وہ ندیم کے ہاں ہی نہیں بلکہ اردو افسانے میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔''۲۶

احمد ندیم قاسمی نے جاگیردارانہ استحصال کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی جبریت کی بھی عکاسی کی ہے۔ ''کفارہ'' جو احمد ندیم قاسمی کا طویل افسانہ ہے۔ اس میں بھی جاگیردارانہ نظام کے پہلو بہ پہلو سرمایہ داروں کی بے حسی کو بھی بیان کیا ہے۔ پیرو جو ایک کسان ہے اس کا باپ جب خیراتی ہسپتال میں داخل ہوتا ہے تو ڈاکٹر رشوت کے طور پر اس کے گھر کی ایک ایک چیز ہتھیا لیتا ہے۔ جب رقم ختم ہو جاتی ہے تو گندم، چاول، مرغے، انڈے اور حتیٰ کہ جانور تک اس ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی پیرو کا باپ بغیر علاج کے مر جاتا ہے۔ بے حسی کی انتہا تو یہ ہے کہ پیرو کے باپ کی لاش کو ہسپتال کے دروازے سے باہر رکھوا کر پیرو کی لائی ہوئی بھیڑ جو ڈاکٹر کی خدمت میں حاضر کی گئی تھی۔ اس کا ڈاکٹر صاحب تفصیلی معائنہ کرتے ہیں کہ بھیڑ قابل قبول ہے بھی یا نہیں۔

''اچھی بھیڑ ہے، صرف چربی کا چکر مکمل نہیں، اور ہاں ، چچ، چچ، چچ بھئی بہت افسوس ہے۔ تمھارا باپ مر چکا ہے، اس کی لاش کو جلدی ٹھکانے لگاؤ ، ورنہ گرمیوں کا موسم ہے نا، بو پڑ جائے گی، سمجھے؟ جاؤ اب، اور ہاں مہتر کو چونی ضرور دے دینا''۲۷

افسانہ نگار نے ڈاکٹر کی اس مادیت پرستی کی طرف اشارہ کیا جس نے ڈاکٹر کو اندھا کر دیا ہے اور وہ اپنے مقدس پیشے کے تقدس کو فراموش کر چکا ہے۔ اسے پیسہ چاہیے ، چاہے غریب اس کے لیے اپنا آپ بیچ ڈالے، افسانے کے اختتام میں جاگیردارانہ استحصال دکھائی دیتا ہے۔ جب پیرو اپنا سب کچھ بیچ کر بیلوں کا جوڑا اور ہل خرید لیتا ہے اور اپنی فصل کو تیار کرتا ہے۔ ایک دھوبن اسے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ جب اس دھوبن کی بیٹی کی شادی کا وقت آتا ہے تو پیرو بیل بیچ کر اس احسان کا بدلہ چکاتا ہے جو اس گھرانے نے کئی سال اس کے ساتھ کیا۔ برات سے ایک رات پہلے وہ بیلوں کو لے کر اپنی فصل پر آخری بار ہل چلانے گیا مگر جاگیردارون کی صف میں شامل ان کے ساتھ ساز باز کرنے والے تھانیدار نے پیرو کو مار مار کر ادھ موا کر دیا اور بیل بھی چھین لیے۔ کیوں کہ کسانوں کو حکم تھا کہ وہ زمین پر ہل نہیں چلائیں گئے۔ ان دیہاتیوں پر الزام تھا کہ انھوں نے ڈاکوؤں کو چھپا رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہ تھا محض یہ ظلم تھا جس کا نشانہ غریب کسان بنتے تھے۔ پہلے پیرو کی خوشیوں کو ایک سرمایہ نے دولت کے لالچ میں لوٹ لیا پھر اس کی زندگی بھر کی محنت کو تھانیدار کے استحصال نے ختم کر دیا۔

''تھانیدار جی تم سفیدوں کو چھوڑ دو، مجھے ساتھ لے جاؤ، مجھے جیل میں ٹھونس دو، میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دو، مجھے گالیاں دو، مجھے ننگا کر دو، پر یہ سفیدے میرے نہیں ، یہ صرف دو بیل نہیں، یہ ایک گھر کی آبرو ہیں۔ یہ ایک معصوم جان کی خوشیوں کا اکلوتا سرمایہ ہیں۔''۲۸

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''توبہ میری'' بھی سرمایہ داروں کہ منہ پر طمانچہ ہے۔ افسانہ نگار نے اس نکتے کو بیان کیا ہے

کہ غریب انسان محنت مزدوری کر کے ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی محنت کی اجرت اس قدر کم ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ اور اگر ان حالات میں بیماری آن پڑے تو دوا دارو کے بجائے یہ لوگ خاموشی سے ختم ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ داران سے محنت تو کرواتے ہیں مگر ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ مگر ان لاچار مزدوروں کی مدد کرتے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

کریموں جو کہ چھکڑا چلاتا ہے اور اپنے بیمار باپ اور غریب ماں کی زندگی کی گاڑی بھی کھینچ رہا ہے۔ چھکڑا چلا چلا کر اس کے پھیپھڑے ختم ہو جاتے ہیں مگر سخت بیماری کے باوجود وہ اس محنت پر مجبور ہے۔ کیوں کہ ماں باپ کا خواب ہے کہ کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو کریم خان کی شادی کر دی جائے۔ مستقبل کے خواب کریم خان کو چھکڑا کھینچنے کی ہمت عطا کر دیتے۔ جب پانی سر سے اوپر گزر گیا تو دم کروایا گیا کیوں کہ آخری حل یہی تھا مولوی صاحب نے بتایا کہ سایہ ہے اور چڑیل اس کا کلیجہ کھا گئی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس بے رحم حقیقت کو بے نقاب کیا کہ دراصل یہ چڑیل اور سایہ وہ سیٹھ اور سرمایہ دار ہیں جو قدرت اور استطاعت رکھنے کے باوجود اس بیمار کی مدد نہیں کرتے وہ کریمو کو چھکڑے پر بوریاں لاد کر قصبے میں لے جانے کو کہتے ہیں۔

> ''ملک جی بولے جنگ کی وجہ سے گیہوں کا نرخ چڑھ گیا ہے نا۔ اس لیے میں آج سو بوریاں قصبے میں بھجوانا چاہتا ہوں صبح صبح وہاں پہنچ جانی چاہئیں کریم اگر آ سکے تو آج رات چھ آنے ملیں گے۔''۲۹

اس سرمایہ دار کو اپنے کاروبار اور منافع سے غرض ہے اسے غریبوں کی بھوک اور گیہوں کے قحط سے مرنے والے لوگوں کا کوئی احساس نہیں اسے اپنا گھر بھرنا ہے۔ کریمو جو موت سے لڑ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کروا یا جائے ملک صاحب نے اسے چھکڑا دے کر بھیج دیا اور اگلے دن وہ اسی چھکڑے پر مردہ حالت میں اکڑا ہوا پایا گیا۔

> ''کریم کی پتلیاں چڑھ گئی تھیں اور تھکی ہوئی آنکھیں ہڈی کے پرانے بنسوں کی طرح بے نور تھیں، ملک جی ناک پر رومال پھیلاتے ایک طرف ہو کر بولے، مر گیا ہے''۔۳۰

اس ایک جملے میں سرمایہ داروں کی نفرت اور حقارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو وہ ان غریب مزدوروں سے رکھتے ہیں۔ الغرض احمد ندیم قاسمی کے افسانے جاگیردارانہ نظام کے عکاس ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر افسانے جاگیرداروں، زمینداروں اور کسانوں کے گرد گھومتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی عکاسی بھی کی ہے۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں، مذہبی پیشواؤں، انصاف کے ٹھیکیداروں، مہاجنوں اور منشیوں سب کے باطن کی گندگی کو باہر نکال کر رکھ دیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری میں یہ موضوعات سب سے نمایاں اور بنیادی ہیں۔ وہ انسان دوست اور سماجی ہمدردی رکھنے والی شخصیت تھی۔ اس معاشرتی محبت اور خلوص نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ان ناہموار معاشی نظاموں کو بے نقاب کریں۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''انسان دوستی اس کا فنی آدرش ہی نہیں مقصدِ حیات بھی ہے۔ چناں چہ احمد ندیم قاسمی نے بدل بدل کر یہی نغمہ گایا ہے۔ اس لیے جب وہ انسان کو غیر انسانی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر کا حساس فنکار تخلیقی سطح پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''۳۱

یہی دوستی اور محبت ان سے ایسے افسانے لکھے جو کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ احمد ندیم قاسمی ایک زیرک ناظر ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے فن کی لطافت میں ڈبو کر پیش کر تے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی زندگی اپنے حسن اور تمام بدصورتیوں سمیت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ دیہاتوں کے جیتے جاگتے ''چوپال'' اور حسرتوں، محرومیوں کے ''بگولے'' ان کی تحریروں میں جھانکتے ہیں۔

وقار عظیم لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کے افسانے جس دیہاتی زندگی کی مصوری کرتے ہیں اس میں ہمیں کئی چیزیں ملی جلی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔۔۔اس میں پنجابیوں کے گھر ہیں، ان کی چوپال ہیں، ان کے کھیت اور کھلیاں ہیں، ان کی چراگاہیں ہیں، رنگینیاں ہیں۔۔۔۔۔ دیہاتوں کی امیری اور غریبی ،غریبی پر امیری کے ظلم و جبر، پیٹ کی آگ ،تن کی عریانی ، بے بسی ،مجبوری یہ سب کچھ تقریباً ایسا ہی ہے جیسا یو۔پی کے دیہاتوں میں ،لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے اور یہ بہت کچھ بلکہ سب کچھ ہمیں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں اپنی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کے ساتھ نظر آتا ہے''۔۳۲

قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے افسانے جن میں جاگیردارانہ نظام کا عکس دکھائی دیتا ہے ان میں افسانہ ''اصول کی بات'' اہم افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے پچاس سالہ بوڑھے اور کمزور عبداللہ نامی ایک کسان کی بے بسی، غربت اور قابل رحم حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس ایک کردار میں افسانہ نگار نے ان تمام کسانوں کی عکاسی کی ہے جو جاگیرداری استحصال کا شکار ہیں۔ ساری عمر کی محنت کے بدلے جاگیردار ان کی جھولی میں ذلت و نامرداری ،غربت و ناداری اور بیروزگاری کی سوغاتیں ڈال دیتا ہے۔ عبداللہ کو بھی ناکردہ گناہ کی پاداش میں نوکری سے نکال دیا گیا۔ غربت کے باعث اس کا جوان بیٹا دق میں مبتلا ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا۔ اب جوان بیٹی اور بیوی کو بھوک کے عذاب سے بچانے کی خاطر وہ دوسرے گاؤں کے زمیندار کے آگے نوکری کی بھیک مانگنے لگا۔ مگر سادہ لوح مجبور کسان نہیں جانتا کہ دیہات بدل لینے سے اور زمینوں کی ہجرت سے آقا تو نہیں بدل سکتے۔ ظلم کی تاریکی نہیں چھوٹ سکتی، افسانہ نگار نے تکنیکی اور تخلیقی فن کو بروئے کار لاتے ہوئے وقفے وقفے سے زمیندار، اس کے کارندوں اور چوپال میں بیٹھنے والے اس کے ساتھیوں کی استہزائیہ ہنسی ،طنزیہ جملوں اور کاٹ دار نگاہوں کی بھی عکاسی کی ہے جو ایک غریب کسان کی عزت نفس کو مجروح کر رہی تھیں۔ ذلت کی کسک آنسو بن کر جب عبداللہ کی نگاہوں سے ٹپکنے لگی تب اس کی بیوی کے منہ سے الفاظ نکلتے ہیں جو اس نظام کی جبریت اور ظلم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں:

''کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے ۔ پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی

لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے ماکھاں کے بابا'' ۳۳؎

کسان کو اگر آنسو بیچ کر بھی روٹی مل جائے تو بڑی غنیمت ہے کیونکہ جاگیردار اس روٹی کی بہت بڑی قیمت لگاتے ہیں۔ غریب کسانوں اور دیہاتوں کی بہو بیٹیوں کی عزت اس روٹی کا قرض اتارنے کی ادنیٰ مثال ہے۔ عبداللہ بھی ایسا بے بس کسان ہے جس کی بیٹی کی عزت جاگیردار کے ہاتھ کھلونا بن گئی۔ احمد ندیم قاسمی نے جاگیرداری نظام میں جکڑی عورت کی ذلت آمیز زندگی کو منفرد انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہی عورت ان کے افسانے ''رانی'' اور ''میرا دیس'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے میں بھی ''ماکھاں'' کا کردار جاگیرداروں کی بربریت، ہوس ناکی اور بہیمانہ رویے کا عکاس ہے۔

افسانہ نگار نے اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ۔ کہ ایک کسان کی بیٹی کی عزت جاگیردار کے لیے ان زمینوں کا معاوضہ ہے جو وہ کسان کو ہل جوتنے کے لیے دیتا ہے۔ یہ نظام ایسی ہی شیطانوں کو جنم دیتا ہے جن کو انسانیت اور ہمدردی چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ ''لارنس آف تھلیبیا'' احمد ندیم قاسمی کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں ''رنگی'' کا کردار بھی دیہاتی کسان کی مظلوم اور بے بس بیٹی کے روپ میں ان تمام عورتوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو جاگیرداروں کے استحصال کا شکار ہو جاتی ہے۔ قاسمی صاحب نے اپنے اسلوب کی ندرت اور علامت کے فن کو استعمال کرتے ہوئے جاگیرداری نظام کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کیا ہے۔ جاگیردار نہ صرف خود بلکہ اس کی اولاد بھی اپنے علاقے کے لوگوں پر قہر بن کر ٹوٹتے ہیں۔ خدا بخش ایسے ہی جاگیردار کا بیٹا ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وحشیانہ جاگیرداری روایت کو مضبوط کرنے میں باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ خدا بخش نے ایک باز پالا ہوا ہے جس کا نام اس نے ''لارنس آف تھلیبیا'' رکھا ہے۔ ''لالی'' جیسے معصوم پرندے کا شکار کرنا اور اسے چیر پھاڑ کر کھانا باز کا محبوب مشغلہ ہے۔ افسانہ نگار نے ''لارنس'' اور ''لالی'' کی علامات کو پر معنی انداز میں برتا ہے۔ مصنف نے ''لالی'' کو ان غریب اور غلامی میں جکڑے دیہاتی لوگوں کے مماثل قرار دیا ہے۔ جو جاگیرداری نظام میں سسکتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ باز کا بے دردی سے معصوم لالی کا شکار اور وحشیانہ انداز میں اس کا چیر پھاڑ کرنا دراصل جاگیرداروں کا معصوم اور غریب عوام کا وحشیانہ شکار ہے۔ جو ہر روز ان کے عتاب کا شکار بنتے ہیں۔ ''رنگی'' بھی ایک ایسی ہی معصوم بے بس ''لالی'' تھی جو خدا بخش کی سفاکی کا شکار ہو گئی۔ رنگی کا باپ جاگیردار کا وفادار ملازم ہے برسوں سے ان کی خدمت کر رہا ہے مگر ایک غریب کی خلوص، محبت اور وفاداری کی جاگیرداروں کی فرعونیت کے سامنے کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ رنگی اس ظلم کے خلاف زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی مگر وہ باز کی گردن مروڑ کر اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ قاسمی صاحب نے اس بے رحم حقیقت کو واضح کیا ہے۔ کہ ایک پرندے کی وقعت غریب کی بیٹی کی عزت سے کہیں زیادہ ہے۔ باز کے مرنے کی خبر سن کر خدا بخش پاگل پن کی حد تک چیختا ہے اور کہتا ہے۔

> ''اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بد ذات، کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا میں اس کی ۔۔۔۔۔۔'' ۳۴؎

قاسمی صاحب نے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا کہ تعلیم بھی ان جاگیرداروں اور ان کی اولاد پر مثبت اثرات ڈالنے میں ناکام ہے۔ اس نظام کی تاریکی کو علم کی روشنی بھی جلا بخشنے میں ناکام ہے۔ جاگیردار، اس کے بیٹے اور اس کے کارندوں کا گاؤں کے نیک سادہ لوح موذن پر تشدد کرنا۔اس نظام کی سفاکی اور جبریت کا عکاس ہے۔ احمد ندیم قاسمی جب گاؤں میں جاگیرداری فضا اور ان کے مظالم کی تصویر کشی کرتے ہیں تو پریم چند کی حقیقت نگاری ہماری نگاہوں میں آموجود ہوتی ہے۔

م۔م۔ راجندر لکھتے ہیں:

> ''افسانے میں گاؤں کی تصویر پیش کرنے میں احمد ندیم قاسمی شاید اپنے سب ہم عصروں سے بازی لے جاتے ہیں، بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی پریم چند کے بعد اگر کوئی واحد افسانہ نگار افسانوں میں دیہات کی بھرپور اور حقیقی زندگی پیش کرنے کا علم بردار ہے تو وہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔'' ۳۵

فسانہ ''جوتا'' جاگیرداروں، زمینداروں اور چوہدریوں کی متعصابہ روش کو بیان کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کی تلخی ہمارے دیہاتوں اور قصبوں میں ایک عفریت بن کر ناچ رہی ہے۔ غریب عوام اپنی خواہشات اور تمناؤں کا قتل عام ہر روز دیکھتے ہیں۔ سخت محنت اور غربت کا عذاب جھیلنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنی معصوم خواہشات کی پامالی کا دکھ بھی سہتے ہیں۔ گاؤں کا جاگیردار، چوہدری، زمیندار کبھی بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ یہ غریب، کم تر، بے بس لوگ اپنی تمنا پوری کر سکیں۔ یہی حقیقت اس افسانے کا موضوع ہے۔ کرموں گاؤں کی قوال پارٹی کا رکن تھا۔ گاؤں کے شادی بیاہ، عرسوں اور میلوں پر گانا اس کا ذریعہ معاش تھا۔ کرموں کی واحد تمنا تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو پڑھا لکھا کر معاشرے کا باعزت شہری بنائے وہ عزت جو اس کا مقدر نہ بن سکی۔ چودھری کی مخالفت کے باوجود اس نے بچوں کو تعلیم دلوائی اور پھر بچے مل میں ملازمت کرنے لگے۔ کرموں کے حالات بہتر ہونے لگے یہاں تک کہ وہ زکواۃ ادا کرنے لگا۔ چوہدری کے لیے یہی بات ناقابل برداشت تھی۔ کہ ایک میراثی کے بچے تعلیم حاصل کریں کہاں یہ کہ اب وہ پیٹ بھر کر کھانے لگے اور زکواۃ بھی ادا کرنے لگے۔ جب کرموں نے چودھری کی طرح اپنی بیٹھک پکی بنوانے کا ارادہ کیا تو چوہدری نے اپنے نوکروں سے اسے سرعام جوتے لگوائے۔

قاسمی صاحب نے کرموں کے کردار میں اس خود اعتمادی کو ابھارا ہے جو آج کے دور میں دیہات کی عوام میں پیدا ہو رہی ہے۔ مگر جاگیرداری نظام اس مضبوطی سے اپنے قدم جما چکا ہے۔ کہ بے بس عوام اس سے ٹکرا کر خود زخم اٹھاتے ہیں۔ مگر اس نظام میں دراڑ نہیں پڑتی۔ ووٹ درج کرنے والے کرموں کو میراثی کی نسبت سے گداگر لکھ دیتے ہیں تو کرموں بلا خوف کہتا ہے:

> ''چودھری کو گداگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے''۔ ۳۶

مگر اس جرأت کی سزا چوہدری پھر سرعام جوتے لگوانے کی شکل میں دیتا ہے۔ کرموں کا بیٹا جب اپنے باپ کو قیمتی کمبل بھجواتا ہے تو چوہدری کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ کرموں سے کمبل خرید لیتا ہے۔ اس لیے نہیں

کہ اسے کمبل پسند آ جاتا ہے۔ بلکہ محض اس لئے کہ اس کی جاگیر میں ایک کمتر میراثی اتنا مہنگا کمبل اوڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ لوگ پاؤں کی جوتی ہیں پاؤں میں ہی رہیں تو بہتر ہے۔ یہ وہ طبقاتی کشمکش اور اخلاقی زوال ہے جو جاگیرداری نظام کی دین ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے مشاہدے کو تجربے کی آگ میں پکا کر اسے تحریر کی زنیت بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ دیہات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے لب ولہجہ میں وہ فطری پن، تاثیر اور حقیقی رنگ جھلکتا ہے جو ان کے افسانوں کو اہم بناتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے افسانوں کے ذریعے واضح کیا کہ جاگیردار اور طاقت رکھنے والا طبقہ کمزور، بے بس اور غریب لوگوں کی حق تلفی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و ناموس، غیرت وحمیت اور انانیت کو بھی تار تار کرتا رہتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے دیہاتی زندگی اور وہاں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانے دیہات کے جیتے جاگتے نمونے ہیں جن میں زندگی اپنی تمام حقیقتوں کے ساتھ سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ قیصر تمکین لکھتے ہیں۔

> ''پنجاب کے دیہات کی تصویر کشی میں قاسمی صاحب کا حریف کوئی ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔'' ۳۷

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''نیلا پتھر'' سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی رنگ کو پیش کرتا ہے اس نظام نے عوام کو اور بہت سارے مسائل کے ساتھ بیروزگاری کا تحفہ بھی دیا۔ خصوصاً دیہات کے وہ لوگ جو چھوٹے چھوٹے پیشوں مثلاً دھوبی، سائیس، موچی، نائی اور گھریلو دستکاریوں سے منسلک تھے وہ صنعتی ترقی اور غیر منصفانہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگے۔ یہ لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنے ان پیشوں کو جن میں وہ ہنر اور مہارت رکھتے تھے۔ چھوڑ کر کارخانوں، بارودی سرنگوں اور زہر اگلتی فیکٹریوں میں مزدوری کریں جس کا وہ تجربہ نہیں رکھتے۔ مصنف نے ایک ایسے دھوبی کی کہانی بیان کی ہے جو گاؤں سے دور پہاڑوں سے نیلے پتھر کاٹتا تھا۔ یہ اس کا پیشہ نہ تھا مگر جب دھوبی کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو تو گھر والوں کو زندہ رکھنے کی خاطر بارودی دھماکوں سے پتھر کاٹنا مشکل نہیں لگتا۔

زمان دھوبی بھی اس جان لیوا مشقت سے امیر سرمایہ داروں کے محلوں کے لیے پتھر کاٹتا، واحد متکلم کے بھائی نے جب زمان دھوبی سے پتھر کاٹنے کی بابت پوچھا تو اس کے نوکدار الفاظ اس تلخ حقیقت کو واضح کر رہے تھے سرمایہ داری نظام نے غریب کو کس قدر بے بس اور ارزاں کر دیا ہے۔

> ''جب دھوبی کے پاس دھونے کو کچھ نہ ہو تو اسے پتھر ہی کاٹنے چاہییں۔ ورنہ وہ افسانوں کو کاٹنے لگے گا۔۔۔۔۔۔۔ کیا کروں چھ بچے ہیں۔ نہ ان کی ماں ہے نہ دادی۔ سب مجھ میں گھسے چلے آتے ہیں بلی کے بچوں کی طرح۔ سب کا دوزخ بھرنا ہوتا ہے اور خدا میرا سہارا ہے اور میں ان کا سہارا ہوں''۔ ۳۸

ان الفاظ میں وہ دکھ، بے بسی اور مایوسی بول رہی ہے۔ جس کا آخری سرا خدا کے سہارے پر جا کر جڑ جاتا ہے۔ سرمایہ داروں اور امراء کو تو معلوم بھی نہ ہوگا کہ کتنے کمزور وجود جو ان کی آسائشوں کا سامان کرتے ہوئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے گھروں کا چراغ جلانے کی خاطر اپنی ہڈیوں کا تیل نچوڑ دیتے ہیں مگر تب

بھی روشنی ان کا مقدر نہیں بنتی۔ زمان دھوبی بھی انھی نیلے پتھروں کی کرچیوں سے اپنی آنکھیں گنوا کر ہمیشہ کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ زمان دھوبی کے ساتھ کام کرنے والے بہت سے نا تجربہ کار مزدور بارود کے دھماکے میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اب ان سب مزدوروں کے بھوکے، بے سہارا بچے اس سرمایہ دارانہ نظام کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ جنھوں نے ان کے کفیلوں کو چھین لیا یوں یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا ہی جائے گا۔ احمد ندیم قاسمی نے واحد متکلم کا کردار افسانے میں شامل کر کے اپنے مشاہداتی تجربے کو نہایت احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے دیہاتی زندگی کے مسائل اور جاگیرداری نظام کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے مسائل اور سرمایہ داری نظام کی جبریت پر بھی قلم اٹھایا۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''گاؤں میں زیست کرنا کتنا کٹھن ہے۔ یہ خاص موضوع ہے قاسمی صاحب کا، مگر ظلم اور جبر کی داستانیں شہروں میں بھی عام ہیں۔ لہذا ندیم نے خود کو محض گاؤں کے ظالم جاگیردار تک ہی محدود نہ رکھا۔''[۳۹]

افسانہ ''اخبار نویس'' بھی سرمایہ داروں کی پست ذہنیت، انسان دشمنی اور ظاہر باطن کے کھلے تضاد کو پیش کرتا ہے۔ عباس نامی اخبار نویس کا کردار آج کے سرمایہ دار معاشرے میں خیر کا علم بلند کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ عباس کے روپ میں احمد ندیم قاسمی نے خود کو پیش کیا ہے۔ قاسمی صاحب چوں کہ صحافت کے پیشے سے بھی منسلک تھے وہ جانتے تھے کہ استحصالی طبقے کے خلاف لکھنا اور قلم کے جہاد میں غیر جانبدار رہنا کس قدر مشکل کام ہے۔ عباس بھی ایک ایماندار اخبار نویس ہے جو ان سرمایہ داروں کے مظالم اور مزدوروں کی مظلومیت کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ نتیجۃً وہ ہر نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ اب کے جو امیر سیٹھ عباس کی لیاقت کو اپنے اخبار کی شہرت کے لیے خریدنا چاہتا تھا وہ نہ صرف دولت مند تھا بلکہ وہ باضمیر اور ایماندار لوگوں کو بے ضمیر اور بے ایمان کرنے کا گُر بھی جانتا تھا۔ سیٹھ نے عباس کو بھاری تنخواہ، بنگلہ، گاڑی اور دیگر مراعات کی پیش کش کی۔ مگر جب عباس نے واضح انداز میں بتایا کہ جب آپ کی ملوں میں ہڑتالیں ہوں گی۔ مزدوروں کی آواز کو دبایا جائے، ان کی حق تلفی کی جائے گی تو میں ان حقائق سے چشم پوشی نہیں کروں گا۔ اس کے جواب میں سیٹھ نے ایسے آئیڈیل اور تخیلاتی حالات کی منظر کشی کی جس میں مزدوروں کو اچھی باسہولت زندگی فراہم کی گئی تھی ان کو اچھی تنخواہیں اور سکون میسر تھا تو پھر بھلا ہڑتالیں کیسے ہو سکتی تھیں۔ مگر جھوٹ کی یہ عمارت اس وقت دھڑام سے گر جاتی ہے جب عباس نوکری کی حامی بھرنے کے کئے سیٹھ کے پاس جاتا ہے۔

> ''اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ فون کے قریب ہی بیٹھا تھا چونگا اٹھایا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا؟ ۔۔۔''ہڑتال اور ہماری مل میں''؟ ۔۔۔ نہ کوئی پیشگی نوٹس۔ نہ بات چیت کی کوئی کوشش۔ یہ کیا غنڈہ پن ہے؟ میں اپنی مل کی یہ ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ مل کی تالہ بندی کر دو۔ ورکرز سے سب سہولتیں ایک دم واپس لے لو۔ اپنی فورس کو کام میں لاؤ۔ پولیس کے پہنچنے

سے پہلے ہی انھیں سیدھا کر دو۔۔۔باسٹرڈز''۔۴۹؎

قاسمی صاحب نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ ان غریب لوگوں کو اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز بھی بلند نہیں کر سکتے اور اگر کوئی انقلابی قدم اٹھائے تو اس اقدام کو کچل دیا جاتا ہے۔ عباس کا نوکری سے انکار کرنا خیر کی فتح کو دکھانا ہے۔ افسانہ نگار نے سیٹھ کے گھر کی آرایش و زیبایش، چمک دمک، مرصع زندگی، عیش وعشرت کا سامان، شراب کا عام استعمال اور پست ہوتی انسانیت کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ قاسمی صاحب نے چھوٹے سے چھوٹے منظر کو بھی مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے کہ پورا افسانہ ایک فلم کی طرح آنکھوں کے پردے پر چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ''عورت صاحبہ'' افسانہ بھی سرمایہ دارانہ اخلاقی زوال اور قدروں کی پامالی کی کہانی ہے۔ ہمارے معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی جڑیں مضبوطی سے گاڑلی ہیں۔ کیپٹلسٹ کلچر، سوچ اور بودوباش نے ہمارے سماج کو زنگ آلودہ کر دیا ہے۔اس طبقے میں اچھی روایات، عزت و احترام اور شرافت کے اعلیٰ معیارات مفقود ہو گئے ہیں۔ بظاہر اعلیٰ معیارِ زندگی رکھنے اور ترقی یافتہ کہلانے والا یہ طبقہ اخلاقی لحاظ سے کس قدر پست اور ذہنی لحاظ سے کس قدر سطحی سوچ کا مالک ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس افسانے سے ہوتا ہے۔

امتیاز جو بہت بڑے سرمایہ دار کا بیٹا، بظاہر مہذب، تعلیم یافتہ اور باشعور نوجوان ہے مگر اخلاقی وفکری لحاظ سے نہایت پسماندہ اور کمزور انسان ہے۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہاں پوری پوری رات لوگ شراب کی محفلوں میں تھرکتے رہتے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی بیویوں کے ساتھ دوسروں کی دلچسپی کا سامان کرتے ہیں۔ فحاشی اور بدکرداری ظاہری چمک دمک میں اپنی شیطانیت کی حشر سامانیاں چھپائے ہوئے ہے۔ امتیاز بھی ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک ہے جو جنسی و اخلاقی زوال کا شکا ہے۔ کلب میں رات گئے تک ''عورت'' ''عورت'' پکارتا اور غیر کی بیویوں سے دست درازی کرتا ہے۔ قاسمی صاحب نے کلب میں موجود لوگوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تعلیم یافتہ، باشعور اور ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے والوں کی باطنی غلاظت، بربادی اور پستی کا عکاس ہے۔ امتیاز نے جب کلب کے ایک ممبر کی بیوی کے ساتھ دست درازی کی تو وہ آگ بگولا ہو کر کلب کے مالک اور امتیاز کے باپ سیٹھ صاحب کے پاس شکایتاً گئے اور کہا کہ آپ خود امتیاز کے ساتھ کلب آیا کریں۔ یہاں افسانہ نگار نے ان سرمایہ داروں کے ظاہر اور باطن کے تضاد کو نہایت منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ سیٹھ صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ کلب آجایا کریں گے مگر اعتراض یہ ہے کہ ان کی عشاء کی نماز لیٹ ہو جائے گی۔ کلب کو چلانے والا یہ سرمایہ دار مذہب کا لبادہ اوڑھ کر پاک صاف بن رہا ہے۔ مگر اس کے باطن میں گندگی ہی گندگی ہے۔ وہ امتیاز کو سمجھاتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ راہ راست پر آجائے بلکہ اس لیے کہ یہ کلب ان کے لیے بہت منافع بخش ہے اسے بدنام نہیں ہونا چاہیے۔ بظاہر نیکی اور پارسائی کا ڈھونگ رچائے یہ سیٹھ صاحب تنہائی کے عالم میں خوب شراب پیتے مگر کلب کی عزت کو داغدار نہ کرتے کیونکہ یہی ان کے سرمائے کو بڑھا رہا تھا۔ المیہ تو یہ ہے کہ زندگی کی تلخیوں سے نا آشنا عیش وعشرت میں مگن ان سرمایہ داروں کو احساس ہی نہیں کہ وہ معاشرے میں شر کو فروغ دے رہے ہیں۔ اور ان کی بڑھتی ہوئی دولت معاشرے میں غریبوں کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کرتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ احساس اور

جذبوں سے عاری ہوتے ہیں۔ بے حس انسانوں کے نزدیک عزت اور شرافت کا معیار وہی گناہ کی دلدل ہے جس میں وہ دھنسے ہوئے ہیں۔

> ''کلب ممبر سیٹھ صاحب کی شرافت اور احساس ذمہ داری کی تعریفیں کرتے اور ایک روز تو ماجد صاحب نے بھی کہہ دیا کہ اگر سب کیپٹلسٹ سیٹھ صاحب کی طرح ہو جائیں تو سوشلزم اپنی موت آپ مرجائے''۔ [۴۱]

اس اخلاقی زوال کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب ایک رات امتیاز نشے میں لڑکھڑایا عورت، عورت پکارتا ماجد صاحب کی بیوی سے بدتمیزی کرتا ہے تو وہ غصے میں اسے اس کی ماں اور بہن کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور کہتے ہیں لو یہ بھی عورتیں ہیں جوان اور حسین بھی ہیں ان سے دست درازی کرو۔ قدروں اور رشتوں کی پامالی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی ایسے قابل اور دراک ذہن کے مالک ہیں جنھوں نے آج کے تہذیبی المیے، قدروں کی پامالی، سیاسی و سماجی بحران اور معاشرتی شکست و ریخت جیسے مسائل کی وجہ بہت سال پہلے دریافت کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے جدید تر فنی و تکنیکی اسلوب، مشاہداتی نقطہ نظر اور پُر تاثر طرزِ اظہار کو کام میں لاتے ہوئے اپنے افسانوں کے ذریعے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ان تمام مسائل کا منبع قرار دیا۔ بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح انھوں نے آج کے فرد اور معاشرے کے مسائل کو گنجلک اور پیچیدہ نظریات اور فلسفیانہ مباحث میں جکڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھوں نے حقیقت کو واضح انداز میں اپنی تحروں میں نقش کر دیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اقدار کی پامالی اور بے معنویت کا سبب ہی یہی تھا کہ جاگیردارانہ نظام نے تہذیبی قدروں کو اپنے فارمولوں کی تاریک کوٹھری میں بند کر کے انہیں تازہ ہواؤں سے محروم کر دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اردو کے ان باشعور ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اس حبس کو بروقت محسوس کر لیا''۔[۴۲]

حوالہ جات:

(۱) فتح محمد ملک، پروفیسر، ''اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام''، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۲

(۲) سلیم اختر ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل، پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۵۲۶

(۳) احمد ندیم قاسمی، چوپال، صفحہ ۲۰

(۴) ایضاً ، صفحہ ۲۵

(۵) ایضاً ، صفحہ ۹۲

(۶) ایضاً ، صفحہ ۹۴

(۷) ایضاً ، صفحہ ۱۶۱
(۸) ایضاً ، صفحہ ۱۶۴
(۹) ایضاً ، صفحہ ۱۶۵
(۱۰) ایضاً ، صفحہ ۳۷
(۱۱) کرشن چندر، بگولے، احمد ندیم قاسمی، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۷
(۱۲) احمد ندیم قاسمی، بگولے ، لاہور: اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۲
(۱۳) احمد ندیم قاسمی، چوپال، صفحہ ۲۱
(۱۴) ایضاً ، صفحہ ۱۴۵
(۱۵) ایضاً ، صفحہ ۱۴۹
(۱۶) احمد ندیم قاسمی، افسانے، خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۵۶۲
(۱۷) ایضاً ، صفحہ ۵۶۶
(۱۸) ایضاً ، صفحہ ۵۷۲
(۱۹) ایضاً ، صفحہ ۵۷۵
(۲۰) احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، لاہور: نیا ادارہ، صفحہ ۱۱۰
(۲۱) ایضاً ، صفحہ ۱۱۵
(۲۲) احمد ندیم قاسمی، افسانے ، خودمنتخب کردہ چالیس بہترین افسانے، صفحہ ۴۸۸
(۲۳) ایضاً ، صفحہ ۴۸۷
(۲۴) فتح محمد ملک، پروفیسر، انداز نظر، لاہور: التحریر، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۳۹
(۲۵) احمد ندیم قاسمی، آبلے ، لاہور: گلوب پبلشرز، صفحہ ۱۲
(۲۶) ایضاً ، صفحہ ۶۹
(۲۷) احمد ندیم قاسمی، بگولے ، لاہور: اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۱
(۲۸) ایضاً ، صفحہ ۴۳
(۲۹) سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: سنگ میل، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۱۷۸
(۳۰) شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، صفحہ ۸۵-۸۶
(۳۱) سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: سنگ میل، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۱۸۲
(۳۲) احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۵۶
(۳۳) ایضاً ، صفحہ ۲۰۳
(۳۴) راجندر، م۔م، فکر و نظر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۸ء، صفحہ ۱۰۳
(۳۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

(۳۶) احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، لاہور: اساطیر ۱۹۹۱ء، صفحہ، ۳۶
(۳۷) قیصر تمکین، تنقید کی موت، کراچی: شہزاد ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۲۰
(۳۸) احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، لاہور: اساطیر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۷۲
(۳۹) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۷ء، صفحہ ۵۰۹ (اخبار نویس)
(۴۰) احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، لاہور: اساطیر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۵۳
(۴۱) احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، صفحہ ۳۱
(۴۲) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اس کا افسانوی ادب، لاہور: عالمین پبلی کیشنز پریس، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۵۸